معانی الآثار و مشکل الآثار للامام الطحاویؒ

از مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفر ایم اے (عثمانیہ)

(۵)

دارالحرب اور مسئلہ سود

یہ دو مثالیں تو میں نے معانی الآثار سے پیش کی ہیں۔ اب چاہتا ہوں کہ مشکل الآثار میں طحاویؒ کا کیا رنگ ہے اس کی مثالیں پیش کروں۔ اس سلسلہ میں عصری دلچسپی کے لئے اس مسئلہ کا انتخاب غالباً مناسب ہوگا جس کی تعبیر امام طحاویؒ کے مطلب کی روشنی میں اس طرح کی جاسکتی ہے کہ

"ہندوستان میں جہاں اسلام اور مسلمانوں کی حکومت باقی نہیں رہی ہے غیر ادیان والوں سے مثلاً مشرکین (ہنود) اور نصاریٰ وغیرہ سے سود لیا جاسکتا ہے؟"

سب جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اس صورت میں اس بات کے قائل ہیں کہ غیر ذمی کا فروں سے جو چیز ربوا کے نام سے لی جائے گی وہ اس سود کے تحت داخل نہیں ہے جسے قرآن نے حرام کیا ہے امام طحاویؒ نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہے۔

اس وقت مجھے ان دلائل کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے جو امام ابوحنیفہ کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں یعنی یہ کہ نصِ قطعی کی رو سے مشرکین سے ان کے مال سے ان کی جان سے بری ہونے کا اعلان "اِنَّ اللّٰہَ بَرِیٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ" کی آیت میں کیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر ان کا وہ مال جسے مسلمان خریدتے ہیں اور نہ ان کو ہبہ اور وراثت میں ملتا ہے صرف قبضہ کرلینے کے بعد وہ اس کے مالک ہوجاتے ہیں اور فکلوا حلالاً طیباً" (اور تم اس مال کو حلال طیب سمجھکر کھاؤ) فرماکر اس مال کو قرآن میں حلال ہی نہیں بلکہ طیب

بھی قرار دیا گیا ہے اور جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ "احلت لی الغنائم" الغنائم (یعنی کافروں کے مال پر قبضہ کرنے کے بعد اس مال کا حلال ہونا) یہ شریعت اسلامی کی خصوصیت ہے۔ پس یہود وغیرہ پر مسلمانوں کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ الغرض غیر ذمی کفار کے اموال کی اباحت بایں معنی کہ جو مسلمان بھی اس پر قابض ہو جاتا ہے مالک ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ ایک بدیہی مسئلہ ہے اور جب یہ بدیہی ہے تو مسلمانوں کو کفار کی رضامندی کے ساتھ ان کے مال کے جس حصہ پر قبضہ کرنے کا موقع ملا ہو اس مال کے مالک ہو جانے کا مسئلہ بھی یقیناً بدیہی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ربوا بین الحربی والمسلم حلال ہے۔ اس پر دلیل قائم کرنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ جو لوگ حرمت کا فتوی دینا چاہتے ہیں ضرورت ان کو ہے کہ اپنے اس بے بنیاد دعوی کی دلیل لائیں۔ جب تک غیر ذمی کفار کے اموال کے عدم اباحت و عصمت کو ثابت نہ کر لیں گے ناممکن ہے کہ وہ اس دعوے پر دلیل قائم کر سکیں کہ ہندوؤں یا نصرانیوں سے ہندوستان میں سود کے ذریعہ سے مسلمان جس مال پر قبضہ کرتا ہے اس کو ناجائز ثابت کر سکیں۔

وَاَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۔ جب تک "الغنیمۃ" یعنی کفار کافروں کے جس مال پر قبضہ کیا گیا ہو اور "الفئ" یعنی جس پر قبضہ "من غیر خیل ولا رکاب" ہو گیا ہو گویا جنگ وجدال کے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا ہو خواہ بہ رضامندی کفار یا بلا رضامندی۔ جب تک ان دونوں قسموں کو حرام نہ ثابت کر لیا جائے اس وقت تک ربوا بین الحربی والمسلم کے عدم اباحت کے اثبات میں بھی کامیابی ناممکن ہے اور نہ اس وقت لا ربوا بین الحربی والمسلم کی مرسل یا موقوف روایت کو پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے اس قرآنی اور اسلام کے کلیاتی قانون کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ صرف امام ابوجعفر طحاویؒ کی دور رس نگاہ کا ایک تجربہ چونکہ اس استدلال سے ہوتا ہے جو اس خاص مسئلہ میں انھوں نے اختیار کیا ہے صرف اسی کو پیش کرنا مقصود ہے واقعہ یہ ہے کہ "سیر کبیر" جو قوانین جنگ وجہاد میں امام محمد بن الحسن الشیبانی کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں قوانین جنگ کی تفصیلات کے سلسلہ میں امام محمدؒ نے اس مسئلہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور

دلائل پیش کرتے ہوئے انھوں نے اس میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق تو عملاً ثابت ہے کہ وہ غیر ذمی کفار (حربی) سے یہ کاروبار کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ دعویٰ انھوں نے کہاں سے کیا ہے۔ طحاویؒ نے امام محمدؒ کے اس دعوے کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ان کا مقصود امام محمد کے اس دعوے کی تشریح ہے۔ اس سلسلہ میں امام طحاویؒ نے جو کچھ کام کیا ہے اسے ہم ذیل کی ترتیب میں ادا کرتے ہیں۔

(۱) انھوں نے پہلے ایک حدیث اپنی سند سے روایت کی ہے جو عموماً کتابوں میں پائی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حجاج بن علاط السلمیؓ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیکر ہجرت کے بعد فتح مکہ سے پہلے مکہ معظمہ اس غرض سے آئے کہ اپنی جائداد اور مال و گھر بار کا کوئی نظم کر آئیں جو بے انتظامی کی حالت میں مکہ ہی میں تھے۔ چلتے ہوئے حجاج نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بھی اجازت چاہی کہ کیا کچھ "توریہ" سے میں کام لے سکتا ہوں یعنی ایسا طرز عمل اختیار کروں جس سے قریش کی برہمی کو کم کرسکوں تاکہ میرے کام میں وہ خلل انداز نہ ہوں۔ اجازت ہوگئی۔ حجاج مکہ پہنچے اور ایک خبر انھوں نے مکہ والوں کے کان تک یہ پہنچائی کہ "ان اصحاب محمد قد استبیحوا وانما جئت لاخذ اھلی و مالی فاشتری من غنائمھم" جس کا بظاہر مطلب یہی سمجھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء لٹ گئے اوران کی جڑ پیڑ اکھاڑ دی گئی۔ استباحہ کے عام معنی یہی ہیں۔ لیکن دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سارے عرب نے ان لوگوں کو اپنے لئے مباح اور حلال قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ پچھلی بات واقعہ ہی تھی۔ دوسرا جملہ کہ میں اپنے گھر بار اور مال و منال کو لینے آیا ہوں کہ ان کے لوٹ کے مال کو خریدوں دوسروں نے خیال کیا کہ صحابہ کا مال جو لوٹا گیا ہے اس کو خریدنا چاہتے ہیں اور ان کی غرض یہ تھی کہ فتوحات میں جو مال غنیمت خیبر میں ہاتھ آیا ہے ان میں سے کچھ میں بھی خریدوں گا۔

الغرض قریش والے تو اپنے مطلب کی بات جو تھی وہی ان کے کلام سے سمجھے اور آگ کی

طرح یہ خبر مکہ میں پھیل گئی کہ مدینہ سے ایک معتبر آدمی یہ خبر لایا ہے کہ مسلمانوں کا قصہ تمام ہوگیا۔ اس زمانہ میں یہودیوں کی مدینہ پر یورش کی خبریں مشہور بھی تھیں۔ یہی سمجھا گیا کہ خیبر کے قلعوں والوں کے سامنے مسلمان کیا ٹھہر سکتے تھے۔ اس لئے ان کا خاتمہ ہوگیا یہ تو اس روایت کا پہلا جزو ہے۔

(۲) دوسرا جزیہ ہے کہ حضرت عباسؓ عم محترم رسول علیہ السلام مکہ ہی میں تھے یہ روایت طحاویؒ نے بایں سند نقل کی ہے۔ عن معمر عن ثابت البنانی عن انس بن مالك ان الحجاج بن علاط السلمی (الحدیث) یعنی آگے وہی قصہ ہے جس کا خلاصہ میں پہلے درج کر چکا ہوں۔ اس کے بعد قابلِ غور حضرت انسؓ کی اس روایت کا یہ جز ہے۔

وفشا ذلك فی اھل مکۃ فبلغ ذلك العباس بن عبد المطلب ففتن بہ واختفی و من کان فیھا من المسلمین واظھر المشرکون الفرح بذلك۔	یہ خبر مکہ والوں میں پھیل گئی جب عباس بن عبد المطلبؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ اس کو سمجھ گئے۔ اور وہ اور جو مسلمان مکہ میں تھے سب روپوش ہوگئے اور مشرکوں نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔

پس قابل توجہ "من کان فیھا من المسلمین" کا حصہ ہے یعنی حضرت عباس اور جو بھی مکہ میں مسلمانوں کی جماعت تھی جس سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اس زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے ان مسلمانوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے۔

(۳) اسی کی تائید ان اجزا سے ہوتی ہے جو اس کے بعد ہیں یعنی۔

فکان العباس لا یمر بمجلس من المشرکین الا قالوا یا ابا الفضل لا یسوٴك اللہ"	عباس جب مشرکوں کی کسی مجلس کے پاس سے گذرتے تھے تو یہ لوگ ان سے کہتے تھے "اے ابوالفضل! خدا تم کو برائی سے بچائے"

"خدا تمہیں برائی سے محفوظ رکھے" یہ دراصل ان پر تعریض تھی۔ حضرت عباسؓ کو پریشانی ضرور ہوئی۔ انھوں نے حجاج کے پاس اپنے غلام کو بھیجکر کہلا بھیجا کہ تم یہ کیا خبر لائے ہو؟ پس اللہ اور اس کے رسول نے جو

وعدہ کیا ہے وہ تمہاری لائی ہوئی خبر سے بہتر ہے"۔

اس سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت عباس اللہ اور رسولؐ پر ایمان لا چکے تھے اور باوجود اس خبر کے اللہ اور اس کے رسول کے وعدہ پر ان کو اطمینان تھا۔ حجاج نے غلام کے کان میں چپکے سے کہا کہ عباسؓ کو سلام کہنا اور کہنا کہ مجھ سے تنہائی میں وہ کہیں ملیں۔ جگہ بھی بتادی اور یہ بھی اشارۃً کہدیا کہ فان الخبر ما یسرہ (اصل خبر تو وہ ہے جو ان کو مسرور کردیگی)۔

حضرت عباسؓ حجاج سے مقام موعود پر تنہائی میں ملے۔ تب حجاج نے خبر سنائی کہ واقعہ بالکل برعکس ہے یعنی اللہ نے رسولؐ کے ہاتھوں پر خیبر کو فتح کردیا ہے۔ پھر خیبر کے کچھ واقعات کا ذکر کیا اور ان سے کہا کہ تین دن تک چپ چاپ رہو تاکہ میں اپنا کام بنا لوں۔ اس کے بعد جو واقعہ ہے اس کا اعلان کردینا چنانچہ یہی ہوا۔ پھر جو غم مسلمانوں کو تھا وہ اب مشرکوں کو ہوگیا اور جو مسلمان روپوش تھے وہ اپنی اپنی جگہوں سے نکل آئے۔

(۴) یہ تو حضرت انسؓ کی روایت کے اجزا تھے اب طحاویؒ کہتے ہیں کہ

فتاملنا ھذا الحدیث فدلنا علی اسلام العباس کان قبل ذلك وھو اقرارہ کان لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالرسالۃ من اللہ وتصدیقہ ما وعدہ۔	جب ہم اس حدیث میں تامل کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسؓ اس واقعہ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے کیونکہ اس روایت میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں اور آپ نے جو وعدہ کیا تھا اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۵) اس کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے یعنی حجاج جب مکہ آئے ہیں اس وقت ربوا مدینہ منورہ میں حرام ہوچکا تھا ان کے دعوے کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد کان الربوا حینئذ فی دار الاسلام حراما علی المسلمین۔	اس وقت ربوا دار الاسلام میں مسلمانوں پر حرام تھا۔

اس دعوی کے ثبوت میں طحاویؒ نے اس مشہور حدیث کو پیش کیا ہے جس میں سودی کاروبا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر ہی میں ایک صحابی کو دوسرے صحابی کے مقابلہ میں منع فرمایا تھا یعنی وہی "قلادہ (ہار)" والا واقعہ جس میں سونا اور دوسری چیزیں بھی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کو الگ کرکے بیچنے کا حکم دیا اور اسی وقت فرمایا تھا کہ الذھب بالذھب وزناً بوزنٍ۔ جس کا حاصل یہی ہوا کہ حرمتِ ربوا کی آیت جنگِ خیبر میں اتر چکی تھی اور مسلمانوں میں باہم ربائی لین دین حرام ہوچکا تھا۔

(۶) ان تمہیدی مقدمات کے بعد طحاویؒ نے اس مشہور حدیث کو یاد دلایا ہے جو حجۃ الوداع کے خطبہ کے نام سے مشہور ہے اور حدیث کی اکثر کتابوں میں موجود ہے جس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ

ربا الجاھلیۃ موضوع واول ربا	جاہلیت کا سود ساقط ہے اور سب سے پہلا ربوا
اضعہ ربا العباس بن عبدالمطلب	جس کو میں ساقط کرتا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب
فانہ موضوع کلہ۔	کا ربوا ہے وہ تمام کا تمام ساقط ہے۔

(۷) اب ظاہر ہے ان تمام امور سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو طحاویؒ نے نکالا ہے یعنی یہ کہ جس زمانہ میں مسلمانوں کو ربائی معاملات سے منع کیا جا رہا تھا خطبۂ نبویہ کے اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ جو اس وقت تک دارالسلام نہ تھا اس میں ایک مسلمان یعنی حضرت عباسؓ کا باوجود مسلمان ہونے کے ربا ساقط نہیں ہوا تھا بلکہ لوگوں پر باقی تھا۔ طحاویؒ خود لکھتے ہیں کہ ساقط تو وہی چیز ہوسکتی ہے جو ابھی تک ساقط نہ ہوئی ہو بلکہ باقی اور قائم ہو ورنہ جو ساقط ہوچکی ہو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ساقط فرماتے۔

طحاویؒ نے اس کے بعد اور زیادہ تشریح سے کام لیا ہے یعنی انھوں نے پوچھا ہے کہ حضرت عباسؓ کے جس ربا کو ساقط کیا گیا سوال یہ ہے کہ وہ کس زمانہ میں لوگوں پر واجب ہوا تھا۔ اگر یہ اس وقت کا

بقایا تھا جس وقت تک ربوا کی حرمت کا حکم قرآن میں نازل نہیں ہوا تھا یا اس حکم کے نازل ہونے کے بعد لوگوں پر ان کا سود چڑھا تھا۔ کہتے ہیں کہ کوئی سی شق ہو اگر

فَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا۔ ربوا کا جو کچھ باقی ہو اسے چھوڑ دو

کا حکم عام مانا جائے تو جہاں کہیں بھی مسلمان تھے ان کا ربوا ساقط ہو گیا ہوتا۔ پھر حضرت عباسؓ کے ربوا کے ساقط نہ ہونے کے کیا معنی؟ اور اگر اس قرآنی حکم کے بعد حضرت عباسؓ کا سود لوگوں پر چڑھا تھا تو بقول طحاویؒ یہ تو پہلی شکل سے بھی زیادہ باطل ہے۔ کیونکہ پہلی صورت میں تو وجوب کے بعد سقوط ہوتا اور اس صورت میں تو واجب ہی نہیں ہو سکتا تھا ساقط کیا ہوتا۔ بہرحال ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کو اصرار ہے کہ

فلما اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبتہ بما دل انما قد کان قائما حتی وضعہ دل ذلک انہ قبل وضعہ ایاہ انما کان الربوا فیہ خلاف الربوا فی دار الھجرۃ لانہ لو کان کما کان فی دار الھجرۃ ما کان قائما فی حال من الاحوال بعد تحریم الربوا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ ربوا اس وقت قائم تھا تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساقط کرنے سے پہلے جو ربوا مکہ میں تھا وہ اس ربوا کے خلاف تھا جو دار الہجرۃ میں تھا کیونکہ اگر وہ دار الہجرۃ کے ربوا کی ہی طرح ہوتا تو تحریم ربوا کے بعد کسی حالت میں بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

ظاہر ہے ان سارے مقدمات کو تسلیم کر لینے کے بعد طحاویؒ نے جو نتیجہ نکالا ہے اس میں کون شک کر سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ان مقدمات ہی میں کسی کو شبہ ہو۔ یعنی ربوا کی حرمت خیبر یا خیبر سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس کا انکار کر دے یا اسے مانے لیکن اس کا انکار کر دے کہ اس وقت یعنی فتح خیبر کے زمانے میں حضرت عباس مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔

طحاویؒ کو معلوم ہے کہ پہلی بات کا انکار ان واقعات کے خلاف ہے جن کا حدیثوں میں ذکر آتا ہے

یعنی فتح مکہ سے پہلے ہی ربوا حرام ہوچکا تھا اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں دوسری بات یعنی فتح مکہ سے پیشتر حضرت عباس رضؓ مسلمان ہوچکے تھے یہ دعویٰ جو طحاویؒ نے کیا ہے اس میں گفتگو کی گنجائش ہے اور وہ اس سے واقف ہیں خود کہتے ہیں کہ

فان اشتبہ علی احد بما کان من امر العباس من اسر المسلمین ایاہ ومن اخذ الفدا منہ محقق بذلک انہ لم یکن بمکۃ مسلما حین جری علیہ ما جری من الاسر

مسلمانوں کا عباسؓ کو گرفتار کرنا اور ان سے فدیہ لینا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ مکہ میں مسلمان نہیں تھے۔

طحاویؒ اس کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ یہ بدر کا واقعہ ہے اور ہم ان کے اسلام کا دعویٰ فتح خیبر کے زمانہ میں کر رہے ہیں لیکن تاریخ پر ان کی جو گہری نظر ہے اس نے ان کو آگے بھی قدم بڑھانے کی اجازت دی۔ مشہور امام المغازی محمد بن اسحاق کی کتاب کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ

ان العباس قد کان اعتذر الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما امرہ ان یفدی نفسہ بانہ کان مسلما وانہ انما اخرج الی قتالہ کرھا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عباسؓ کو فدیہ ادا کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کی اور کہا کہ میں تو مسلمان ہوں مجھکو زبردستی جنگ میں لے آئے تھے۔

طحاوی کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کی اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی مسلمان تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسا کہ ابن اسحاق ہی کی روایت میں اس کے بعد ہے۔

اما ظاھر امرک فقد کان علینا فافد نفسک۔

تمہارا ظاہر معاملہ تو ہمارے سامنے ہے اپنے نفس کا فدیہ پیش کرو۔

پھر اپنی سند کو ابن اسحاق تک پہنچا کر اتنا اور اضافہ کرتے ہیں۔

ولم یتجاوزہ وبقی العباس بعد ذلک بمکۃ

اور ان سے تجاوز نہیں کیا اور عباس اس کے بعد مکہ میں ہی

آخر میں اپنا فیصلہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں۔

فان یکن ما ذکرہ ابن اسحاق کما ذکرہ	اگر ایسا ہی ہو جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے تو بدر میں اسلام
فقد تقدم اسلامہ بدروان یکن بخلاف	لانے کا تذکرہ پہلے ہی آچکا ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو انس
ذلک کان ما ذکرہ انس بن مالک فی	بن مالکؓ نے حجاج بن علاط کی حدیث میں جو کچھ کہا ہے وہ
حدیث الحجاج بن علاط یوجب الاسلام	صحیح ہوگا اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فتح خیبر کے وقت
وذلک عند فتح خیبر وھکذا القولین	عباس مسلمان تھے۔ بہرحال دونوں اقوال سے یہ بات ثابت
یوجبا قامتہ بمکۃ مسلما وھی دار الحرب۔	ہوتی ہے کہ عباس مکہ میں بحیثیت مسلمان مقیم تھے اور مکہ دارالحرب تھا۔

اس پر اس فقرہ کا اور اضافہ کرتے ہیں۔

واقامتہ بھا فیما ذکرہ ابن اسحاق اوسع	ابن اسحاق کے بیان کے مطابق عباس کا مکہ میں قیام کرنا باعتبار
مدۃ من اقامتہ بھا فیما ذکر فی حدیث	مدت زیادہ وسیع ہے بہ نسبت اس قیام کے جس کا ذکر انس بن
انس بن مالک الذی ذکرناہ۔	مالک کی روایت میں آیا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

غرض اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عباسؓ مکہ میں مسلمان تھے اور وہاں سودی کاروبار کرتے تھے۔ حالانکہ یہ کاروبار دارالہجرت (مدینہ) میں مسلمانوں کے درمیان حرام تھا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ "امام ابوحنیفہؒ اور ثوریؒ کے بیان کے مطابق دارالحرب میں اگر مسلمانوں اور اہل حرب کے درمیان سودی لین دین ہو تو وہ مباح ہے"۔ طحاویؒ نے اپنی اس عبارت میں بھی ایک جدید علم عطا کیا جو فقہ کی خاص کتابوں میں بھی موجود نہیں ہے یعنی سب ربوا کے متعلق اس مسلک کو صرف ابوحنیفہؒ اور زیادہ سے زیادہ ان کے شاگرد محمد بن حسن کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن غالباً یہ ان کی کتاب کی خصوصی خبر ہے کہ سفیان ثوری بھی اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے ہم نوا تھے۔ طحاویؒ نے فقط دعویٰ ہی نہیں کیا ہے بلکہ سند کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی کیسی سند فرماتے ہیں۔ حدثنا ابراھیم بن ابی داؤد قال حدثنا نعیم قال حدثنا

ابن المبارك عن سفیان بذلك - انھوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ اس سے بھی عجیب تر انکشاف یہ ہے کہ استاد الکوفہ امام التابعین حضرت ابراہیم نخعی کا بھی یہی خیال تھا۔ طحاویؒ نے یہ لکھکر کہ قال ابو جعفر وقد قال قبلھم ابراھیم النخعی۔ اور متصل سند کے ساتھ ابراہیم النخعی تک اسے ان کے خلیفۂ رشید حماد بن ابی سلیمان کے واسطہ سے پہنچاتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ ہی کو جو بدنام کیا گیا ہے یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ آخر جب استاذ المحدثین سفیان الثوری اور ابراہیم نخعی کا یہ مذہب تھا تو امام ابو حنیفہؒ پر طعن کرنے والے اب کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ثوری اور نخعی کو بھی مطعون ٹھیرایا جائے تو حدیث کا یہ سارا کارخانہ کیا باقی رہ سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے طحاویؒ کے علوم ان کی دونوں کتابوں معانی و مشکل میں جو پائے جاتے ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو مجلدات کی ضرورت ہے۔ معانی الآثار میں تو زیادہ تر فقہیات کے اختلافی آثار سے بحث ہے لیکن ان کی کتاب مشکل الآثار کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ مشکل ہی سے اسلامی علوم کی کوئی ایسی شاخ باقی رہ گئی ہے جس کے کسی نہ کسی اہم مسئلہ پر لطیف بحث انھوں نے نہ کی ہو۔ صرف قرآن ہی کے متعلق اگر دیکھا جائے تو تاریخ القرآن، قراۃ القرآن، آیات القرآن کے مختلف اہم مباحث کا ایک ذخیرہ اس کتاب میں جمع ہو گیا ہے۔ خصوصاً قرآن کی جمع و ترتیب سور قرآنیہ کے متعلق مختلف تاریخی سوالات مثلاً معوذتین کے متعلق سورۃ انفال و براۃ کے متعلق جو مباحث عام کتابوں میں پائے جاتے ہیں -- طحاویؒ نے الآثار کی روشنی میں جو صحیح نتائج ان کے متعلق پیدا کئے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ اسی طرح قراۃ القرآن کے متعلق سبعۃ احرف کا جو مطلب طحاویؒ نے بیان کیا ہے۔ کسی ایک کتاب میں ان سب کا ملنا دشوار ہے۔ صرف آثار جمع ہی نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ان سے نتائج بھی پیدا کئے گئے ہیں اور ایسے نتائج کہ مشکل ہی سے کوئی ان سے اختلاف کر سکتا ہے۔

قرآن کے بعد حدیثوں کا وہ ذخیرہ جن کا تعلق سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مثلاً

کعب بن اشرف یہودی کا قتل سلمہ بن اکوع کے مقتول کا قصہ ازواج مطہرات، ان کی تعداد ان کے حالات، بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نجاشی اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قصہ شق القمر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام وفات وغیرہ۔ بیسیوں ابواب اور ان کے مشکلات کو حل کیا گیا ہے پھر متفرق احادیث مثلاً عدویٰ، طیرہ، شوم، غول، شدرحال، تفاول، اخراج یہود و نصاریٰ من جزیرہ العرب۔ نجبا اصحاب۔ قتل مرتد، ایلچی کا قتل، ابن صیاد، دجال، دخان وغیرہ سینکڑوں ابواب کے متعلقہ آثار۔ ان آثار کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہے۔ حدیث میں لغوی مشکلات جو ہیں ان کا بھی ایک ذخیرہ اس کتاب میں درج ہے۔ اور غریب الحدیث کے امام مثلاً ابو عُبید قاسم بن سلام کے علاوہ خود امام شافعی جو علاوہ اجتہادی مسائل کے غریب الحدیث کے باب میں مستند امام مانے جاتے ہیں ان کے حوالہ سے بھی طحاوی نے نادر چیزیں اس کتاب میں جمع کردی ہیں۔ مشہور حدیث "اقروا الطیر علی مکناتھا" کو حل کرتے ہوئے طحاوی نے پہلے تو اپنے ماموں المزنی کے حوالہ سے بایں الفاظ "سمعت المزنی یقول قال الشافعی الخ" پھر امام شافعیؒ کے اور دو شاگردوں "سمعت یونس وسمعت الربیع المرادی جمیعاً یحدثان عن الشافعی فی تفسیر ھذا الحدیث الخ" اس کا وہی مطلب بیان کیا ہے کہ جاہلیت میں شگون یا بدشگونی پرندوں سے لینے کی لوگوں کو عادت تھی۔ اس لئے پرندوں کو ان کے ٹھکانوں سے اڑا کر پریشان کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔ امام شافعیؒ کی اس شرح کو نقل کرنے کے بعد طحاوی لکھتے ہیں کہ

> فھذا الجواب حسن یغنینا عن الکلام فی ھذا الباب بغیر ما ذکر فیہ عن الشافعی (ج ۱ ص ۳۴۳)
>
> یہ جواب اچھا ہے۔ اب امام شافعیؒ کے علاوہ کسی اور کے قول نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ میں نے قصداً اس لئے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے المزنی اور طحاویؒ کے قصہ کی وجہ سے کچھ ایسا مشہور کر دیا ہے کہ ذاتی طور پر ان کو المزنی سے یا ان کے استاد امام شافعیؒ سے خدانخواستہ کوئی کد پیدا ہو گئی تھی۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ کے کلام کو کس احترام کے ساتھ نقل کرتے ہیں گویا ان کے فرمانے کے بعد وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اس باب میں کسی اور کا قول پیش کیا جائے اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ علم اس قسم کی دنائت اور تنگ نظری کو برداشت نہیں کر سکتا جس میں خواہ مخواہ ذاتیات کو دخل دیا جائے جس مسئلہ میں جس کی جو رائے ان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے اسی کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ کوئی ہو۔ مذکورہ بالا حدیث میں تو امام شافعیؒ کے قول کو کافی قرار دیتے ہیں مگر دوسری جگہ یعنی مشہور حدیث اذا ھلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده واذا ھلك قيصر فلا قيصر بعده" کی شرح میں اپنے ماموں المزنی کے حوالہ سے امام شافعیؒ کی توجیہ و تاویل نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قریش کی تجارت شام اور عراق میں تھی اور اول الذکر قیصر کے تحت تھا ثانی الذکر کسریٰ کے۔ اس لئے قریش کو خطرہ ہوا کہ اسلام کی وجہ سے دونوں حکومتیں ہم سے کہیں بدک نہ جائیں اور تجارت کو نقصان نہ پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کی۔ کہ نہ شام پر قیصر کا تسلط رہیگا اور نہ عراق پر کسریٰ کا۔ امام شافعیؒ کے اس مطلب کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے استاد ابن ابی عمران کے حوالہ سے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "کسی خاص ملک سے ان دونوں حکومتوں کے تسلط کا ازالہ اس حدیث میں نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں ساری دنیا ان ہی دو سیاسی قوتوں کے زیر اثر آگئی تھی۔ مشرق میں اقتدار اعلیٰ کی حیثیت کسریٰ کو اور مغرب میں یہی حیثیت قیصر کو حاصل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور گو ملک عرب سے ہوا لیکن آپ کی نبوت مشرق اور مغرب دونوں کے لئے عام تھی۔ اور دونوں غلط تمدنوں کی اصلاح کر کے ایک عالمگیر صالح اسلامی تمدن کا پیغام لیکر آپ تشریف لائے تھے۔ تو اب مراد یہ ہوئی کہ مشرق اور مغرب دونوں کے شیطانی تمدنوں کا خاتمہ ہو کر رہیگا اور جب خاتمہ ہو جائے گا تو پھر یہ دونوں سر اٹھا نہیں سکتے۔ لیکن کسریٰ کا معاملہ تو صاف تھا کہ ہلاک ہوا اور ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو گیا۔ مگر قیصر اور قیصریت یا دوسرے لفظوں میں مغرب اور مغربیت اب تک باقی ہے وہی رومانی اور یونانی

تمدن ہے۔ جو موجودہ مغربی تمدن کی شکل میں نمایاں ہوا ہے پھر حدیث کا کیا مطلب ہے؟

ابن ابی عمران نے اس کا جواب "انہ سیھلک لخ" سے دیا۔ یعنی قیصریت اور رومانویت ویونانیت کا بھی خاتمہ ہو کر رہیگا۔ بعض روایتوں میں الفاظ ہی کچھ بدلے ہوئے ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں یہ روایت بایں الفاظ درج ہے۔ اذھلك کسری فلا کسری بعدہ ولیھلکن قیصر فلا قیصر بعدہ۔" جس کے معنی یہ ہوئے کہ قیصر کے ہلاک ہونے میں جو وقفہ ہونے والا تھا اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اشارہ فرما دیا کہ یہ واقعہ زمانہ مستقبل میں ہوگا۔ لیکن یہ سوال کہ دونوں کے ہلاک ہونے میں یہ تفاوت کیوں پیدا ہوا۔ طحاویؒ نے ابن ابی عمران ہی کے حوالہ سے اس کی وجہ بتائی ہے کہ دونوں کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کے پہنچنے کی تاریخوں میں فرق ہے۔

اس کے بعد اپنی خاص سند سے دونوں (قیصر و کسریٰ) کے پاس نامہ مبارک کے پہنچنے کے وقت جو برتاؤ کیا گیا تھا اس کو بیان کیا ہے یعنی بخاری کی وہی روایت کہ قیصر نے خط کو احترام کے ساتھ لیا ابوسفیان دربار میں حاضر کئے گئے۔ سوال و جواب ہوا، قیصر نے اعلان کیا "کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر وہ سچ ہے تو قریب ہے کہ وہ (پیغمبر اسلام) میرے پاؤں تلے کی زمین کے مالک ہو جائیں"۔

پھر آخر میں قیصر (ہرقل) نے یہ بھی کہا کہ "اگر مجھ کو اس کی توقع ہوتی کہ میں ان (پیغمبر اسلام) تک پہنچ جاؤں گا تو میں ان سے ملتا اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے قدم دھوتا"۔

اسی طرح کسریٰ نے نامۂ مبارک کے پڑھنے کے بعد جو کچھ کیا تھا اسے بھی طحاویؒ نے نقل کیا ہے یعنی یہ کہ اس نے پھاڑ دیا۔ طحاویؒ کہتے ہیں۔

قال ابن شھاب فحسب ان ابن المسیب	ابن مسیب کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
قال فدعا علیھم رسول اللہ صلی اللہ	نے کسریٰ کے حق میں بددعا کی یہ لوگ بھی بالکل
علیہ وسلم ان یمزقوا کل ممزق۔	مٹا دیئے جائیں۔

دونوں روایتوں کو درج کرنے کے بعد اب اپنے استاد کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اس بنا پر دونوں کی ہلاکتوں میں عجلت اور تاخیر کا فرق ہوا۔" آگے چلکر اس کی تائید میں کہ بالآخر قیصریت بھی تباہ و ہلاک ہوکر رہے گی صحاح کی مشہور حدیث کو پیش کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" کہ قیصریت کے تمام خزانے اللہ کے راستے میں یقیناً خرچ کئے جائیں گے۔"

اس کے بعد فتح قسطنطنیہ وغیرہ کی حدیثوں کو ذکر کرکے انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قیصر کا یہ شہر بھی فتح ہوکر رہے گا۔ طحاویؒ نے تیسری صدی میں یہ دعویٰ کیا تھا اور بحمداللہ سلطان محمد فاتح کے ہاتھ پر ان کا یہ دعویٰ تو پورا ہوکر رہا۔ اگرچہ قیصریت کسی نہ کسی شکل میں ابھی باقی ہے۔ یعنی رومانوی تمدن ہلاک تو کیا اس وقت تو برسرِ عروج ہے لیکن بہرحال" ہلاک قیصر" یقینی ہے۔ جیسا کہ امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔

بہرحال میری غرض اس وقت اس کے نقل کرنے سے یہ تھی کہ حضرت امام شافعیؒ کا جو قول طحاویؒ کو پسند آیا ہے کشادہ دلی کے ساتھ انھوں نے اس کو قبول کرلیا ہے۔ دوسری طرف رہا خود ائمہ احناف مثلاً امام ابوحنیفہؒ، ابویوسفؒ، محمد بن حسنؒ وغیرہ سے اختلاف کا قصہ؟ تو ان کی مثالوں سے ہمارے پیشرو فارغ ہوچکے ہیں۔

امام طحاویؒ کی یہ خصوصیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے کہ ایک طرف ان پر عقلیت کا زور ہے جس کے شواہد گذر چکے۔ اور دوسری جانب ان پر نقلیت کا اس درجہ غلبہ ہے کہ جب ان کے سامنے سند صحیح سے ایک چیز آجاتی۔ ہے تو پھر وہ اس پر جم جاتے ہیں اور اگر عقلاً اس پر کچھ اعتراضات واقع بھی ہوں تو وہ ان کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ ارباب علم کو معلوم ہے کہ معجزہ شق القمر کی نسبت علمار میں باہم اختلاف ہے کہ یہ معجزہ ہوچکا یا قیامت کے قریب واقع ہوگا۔ امام طحاوی دونوں قسم کے حضرات، کی آرا اور ان کے دلائل نقل کرنے کے بعد پہلی شق کو ترجیح دیتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔ وکان فیما ذکرنا عن علی وابن مسعود وحذیفہ وابن عمر وابن عباس وانس تحقیقہم انشقاق القمر۔

ایک واقعہ جب کثیر صحابہ بیان کرتے ہیں تو ان سے الگ ہو کر محض عقلیت کے زور میں مخالفت کرنا کیا ایمان کا مقتضا ہو سکتا ہے اور فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ کا خلاف تو گویا خود اللہ کی کتاب سے سرکشی کرنا ہے اور جو لوگ اللہ کی کتاب سے اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب سے سرکشی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو فہم قرآن سے محروم کر دیتا ہے۔

دراصل اس بحث کے نقل کرنے سے میری غرض یہ دکھانا ہی تھا کہ طحاوی کا اسلامی حقائق کے سمجھنے میں صحیح مسلک کیا تھا؟ وہ قرآن کی ظاہر آیات اور احادیث و آثار کے کھلے کھلے واضح معانی سے ہٹنا نہیں چاہتے۔

کتاب و سنت پر امام طحاویؒ کے اعتماد کی کیفیت

کتاب اور سنت پر اعتماد کی کیفیت ان کے قلب میں کس درجہ راسخ ہے اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو مشکل الآثار کے شروع میں انھوں نے درج کیے ہیں۔ کتاب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے وہ کتاب نازل فرمائی جو "خاتما لکتبہ وھیمنا علیہ ومصدقا لھا" یعنی دنیا کے کسی خطہ میں خدا نے جن صداقتوں کو مختلف زبانوں میں تقسیم فرمایا تھا سب کو سمیٹ کر اور ساری صداقتوں کی تصدیق فرما کر مسلمانوں کو یہ کتاب اس طریقہ سے سپرد کی گئی ہے کہ اب خدا کی اور کوئی کتاب کسی قوم کو نہیں ملے گی۔ اور نہ اس کتاب کے سوا نجات کی راہ باقی ہے کہ یہی خاتم الکتب ہے۔ پھر سنت کے متعلق فرماتے ہیں قرآن ہی سے استدلال کرتے ہیں یعنی حق تعالیٰ نے قرآن ہی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حسب ذیل سات باتیں نازل کی ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کریں۔

(۲) آپ سے آگے نہ بڑھا جائے (یعنی حکم نبوی سے)۔

(۳) ما ینطق عن الھوٰی الآیہ فرما کر یہ بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں خدا

اس میں آپ کی نگرانی کرتا ہے۔

(۴) ما اٰتاکم الرسول الآیہ فرماکر اس بات کا حکم دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لائے ہیں ان کو لے لیا جائے اور جس سے آپ منع فرماتے ہیں اس سے رکا جائے۔

(۵) اس بات سے منع فرمایا کہ لوگوں کا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسا ہو کہ جیسا وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔

(۶) اور اس بات سے ڈرایا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو کہیں ان کے اعمال حبط نہ ہو جائیں در آنحالیکہ انھیں اس کی خبر بھی نہ ہو۔

(۷) جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرایا کہ کہیں ان کو کوئی فتنہ یا عذابِ الیم نہ پہنچ نہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام طحاوی نے سنت کے متعلق ان "آیات سبعہ" کے مفاد کو ایک جگہ جمع کرکے جس قوت کے ساتھ سنت کی اہمیت واضح کی ہے اگر اس کی تفصیل کی جائے تو صفحات بھی کافی نہ ہوں گے اور کتاب وسنت کے بعد تیسری چیز جس کی ان کی نگاہ میں دیناً بہت اہمیت ہے وہ عمل صحابہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس کو الاستکبار عن کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ پھر صحابہ کے ساتھ سلف صالح کی ان کی نظر میں جو وقعت ہے اس مسئلہ شق القمر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

ولا نعلم روی عن احد من اھل العلم وھم القدوۃ والحجۃ الذین لایخرج عنھم الاجاھل ولا یرغب عما کانو علیہ الاجابر[۱]

اور سوائے جابر کے ہم کو نہیں معلوم کہ اہل علم جو ایسے امام اور حجت ہیں کہ ان کے خلاف سوائے جاہل کے کوئی اور خروج نہیں کرسکتا اور نہ ان کے مسلک سے انحراف کرسکتا ہے ان میں سے کسی اور سے بھی روایت ہو۔

---

[۱] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۰۳۔

"اہل العلم" سے ان کی مراد وہی ائمۂ امصار ہیں اور یہی وہ "مسلک محفوظ" ہے جو انسان کو ایمانی دائرہ سے حتی الوسع نکلنے نہیں دیتا ورنہ جس نے صحابہ اور سلف صالح سے لاپروائی برتی بقول ابن ابی عمران پہلی لعنت اس پر تو وہی سوار ہوتی ہے کہ "فہم قرآن" سے وہ محروم اور قطعاً محروم ہو جاتا ہے اور جس کی سمجھ میں قرآن ہی نہ آیا اگر اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے تو کیا آیا۔ لیکن جس نے خود اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کے حقیقی دستور العمل کو نہ سمجھا اس نے درحقیقت کچھ نہ سمجھا اور بغیر کچھ سمجھے ہوئے دنیا سے مر گیا۔

نقل پر یا اتباع سلف صالح پر زور دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ انسان کے لطیف جوہر عقل کو بیکار کر دینا چاہتے ہیں۔ اب تک طحاویؒ کے چند لطائف کے ذکر کا جو مجھے موقع ملا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ذہنی حیثیت سے طحاوی کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ بیر بضاعہ والی حدیث کے مطلب کے بیان کرنے میں جس دینی عقلیت کا ثبوت انھوں نے پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو دین کو بدعقلی اور حماقت کے مرادف بنا دیتے ہیں۔ ابھی کتاب، سنت صحابہ اور سلف صالح کی ان کی نگاہ میں جو اہمیت ہے وہ آپ پر واضح ہو چکی ہے۔ لیکن ان چیزوں پر اس اصرار کے باوجود بکثرت حدیثوں کی شرح میں انھوں نے اپنے عقلی جوہر کو جس شکل میں نمایاں کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے زمانہ کے علمار نے اپنے اندر "نقل و عقل" کا امتزاج کس خوبی کے ساتھ کیا تھا۔ میں امام طحاویؒ کے کلام سے آخر میں اس کی بھی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مشہور حدیث "اکثر اھل الجنۃ بُلہٌ" (جنت کے اکثر لوگ ابلہ ہوں گے) مشکل الآثار میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد ابن ابی عمران سے اس حدیث کا مطلب پوچھا جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ حماقت کی وجہ سے جو عقلی نقص کا شکار ہوں۔ حدیث میں ان احمقوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے ناآشنا ہو کر زندگی گزارتے ہوں اور زنا شراب جوا

مکاری فریب اور ان محارم اللہ کے گھر گھاٹ سے واقف نہ ہوں۔ یہ تو استاد کی زبان سے حدیث کا مطلب بیان کیا ہے پھر اس کے ثبوت میں انھوں نے قرآن کی آیت پیش کی ہے جس میں کافروں کو فرمایا گیا ہے کہ "لهم قلوب لا يفقهون بها" جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔ تو ایک کافر باوجودیکہ دنیا اس کی سمجھ میں خوب آتی ہے لیکن دین کی سمجھ سے چونکہ عاری ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو ایسا دل قرار دیا جس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اسی طرح جس کی سمجھ میں دین کی ساری باتیں آتی ہوں لیکن دین کے خلاف محارم اللہ اگر سمجھ میں نہ آئے تو باوجود دین میں تفقہ کے اگر محارم اللہ کے حساب سے بلہ کا اطلاق اس پر کیا گیا تو قرآن کے اس اطلاق سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

پھر صحاح کی مشہور حدیث جس میں اشراط ساعت کے ذکر میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ

اذا رأيت الحُفاةَ العُراةَ البُكم الصم ملوك الارض۔ — جب تم بادشاہوں کو ننگے پاؤں، برہنہ جسم اور گونگا بہرا دیکھو۔

طحاوی نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ گونگے اور بہرے سے مراد متعارف معنی نہیں ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ پسندیدہ قول سے گونگے بہرے ہوں گے۔ پھر کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کے نظائر بکثرت ہیں۔ اس کے بعد ان سب چیزوں سے استاذ کے مطلب کی توثیق کرتے ہوئے انھوں نے اشراطِ ساعت والی دوسری مشہور حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک سال مہینہ، مہینہ ہفتہ۔ اور ہفتہ ایک دن اور دن ایک گھڑی اور گھڑی ایک چنگاری کے برابر نہیں ہو جائیگا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا قیامت کے دن واقعی سال ایک مہینہ کا اور اسی طرح مہینہ ہفتہ ہفتہ دن۔ اور دن گھڑی کے برابر ہو جائے گا۔ طحاوی کے نزدیک حدیث کا مطلب وہ نہیں ہے جو ظاہر لفظوں سے سمجھ میں آتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بارہ مہینوں کا سال تیس دن کا مہینہ اور سات دن کا جو ہفتہ ہوتا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ بلکہ لوگوں کے احساس میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی جیسے شعراء ہجر کی

راتوں کی درازی اور وصل کی راتوں کے اختصار کو بیان کرتے ہیں کہتے ہیں کہ

فرہاد نہ پوچھ سختیِ ہجر   دن آج پہاڑ سا کٹا ہے

طحاوی بھی یہی کہتے ہیں کہ "ھذا علی التشاغل فی اللذات" یعنی لذتوں میں انہماک اتنا بڑھ جائے گا کہ ساری عمر وصل کی رات کی طرح مختصر ہو کر رہ جائے گی۔ اگرچہ طحاوی نے حدیث کے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ یہی مطلب اہل علم میں سے ایک شخص ابوسنان سے بھی مروی ہے۔ پھر ابن ابی عمران کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ابوسنان سے ہم نے اس حدیث کا مطلب پوچھا تو انھوں نے یہی کہا۔ طحاوی لکھتے ہیں کہ یہی تاویل حسن ہے جو ہمارے بیان کے موافق ہے۔

اسی طرح دوسری مشہور حدیث کہ قیامت کے دن موذنین "اطول الناس اعناقاً" ہوں گے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہی ہوا کہ ہر موذن قیامت کے دن جو آئے گا تو اس کی گردن لانبی ہوگی طحاوی اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اذان چونکہ قرآن کی رو سے بہت بڑی نیکی ہے جیسا کہ آیت قرآنی ومَنْ احسنُ قولاً ممن دعا الی اللہ   اور جو لوگ اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور اعمال صالحہ

وعَمِلَ صالحاً۔   کرتے ہیں ان سے بہتر کون ہے۔

سے ثابت ہوتا ہے اور چونکہ یہ بہت بڑی نیکی ہے اس لئے اس کا ثبوت بھی بہت زیادہ ہوگا۔ پس اذان دینے والے اپنے اعمال کے اجر کے افراط کو دیکھ کر گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے اور بس یہ ہے ان کے طول اعناق کا مطلب طحاویؒ کہتے ہیں کہ بجنسہ اسی کی معکوس کیفیت کا ذکر قرآن میں ہے

فظلت اعناقھم لہا خاضعین   ان کی گردنیں جھکی جھکی رہیں گی۔

پس جس طرح مجرموں کی گردنیں جھکی جھکی رہیں گی۔ اربابِ طاعات اس کے مقابلہ میں اپنی نیکیوں کے اجر کو گردن بڑھا بڑھا کر دیکھیں گے۔ جھانکیں گے۔ طحاوی اس مطلب کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ

"اس حدیث کی تاویل وتوجیہ میں جو کچھ لوگوں نے کہا ہے ہم نے ان میں سے کسی تاویل کو اپنی مذکورہ تاویل سے بہتر نہیں پایا"

مگر آخر میں جیسا کہ سلف کا طریقہ تھا یہ بھی لکھدیتے ہیں کہ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ اس سے مراد کیا ہے اور ہم اسی سے توفیق طلب کرتے ہیں"۔ اگرچہ انھوں نے تصریح تو نہیں کی لیکن اس کے بعد اس حدیث کا ذکر کیا ہے کہ ازواج مطہرات کے متعلق ارشاد ہوا تھا کہ

اسرعکن بی لحاقاً اطولکن یداً۔	تم میں سے جس کا ہاتھ سب سے زیادہ لانبا ہے وہ مجھ سے سب سے پہلے آکر ملیگی۔

جیسا کہ امہات المومنین سے مروی ہے وہ اس حدیث کی بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دیوار پر ہاتھ رکھکر ناپا کرتی تھیں کہ ہم میں کس کا ہاتھ سب سے زیادہ لانبا ہے مگر جب سب سے پہلے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہوا تب سمجھا گیا کہ طولِ ید سے مراد جود وسخا اور صدقہ وخیرات تھا نہ کہ سچ مچ ہاتھ کی درازی جیسا کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔

کانت امرأۃ قصیرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ولم تکن اطولنا یداً فعرفنا حینئذ انما اراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصدقۃ وکانت زینب صناعۃ الید تدبغ الخیر و تخرز وتتصدق بہ فی سبیل اللہ۔	حضرت زینبؓ پست قامت تھیں اور ان کا ہاتھ ہم سب سے زیادہ دراز نہ تھا۔ اس بناپر اب ہم کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ مراد لیا تھا اور حضرت زینبؓ واقعی بڑی کشادہ دست تھیں۔ خیر خیرات بہت کرتی تھیں سخی تھیں اور اللہ کے راستہ میں صدقہ دیتی تھیں۔

بظاہر میرے خیال میں طحاویؒ نے اس لئے موذنوں کی حدیث کے بعد اس کا ذکر کیا ہے کہ یہاں بھی

طولِ ید سے۔۔۔ درحقیقت طولِ ید مراد نہ تھا بلکہ جود اور صدقہ میں فراخ دستی مراد تھی۔ اسی طرح مؤذنوں کے طولِ اعناق سے واقعی طول اعناق مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو بیان کیا گیا۔

طحاوی نے احادیث کے مطلب بیان کرنے میں اس قسم کا طریقہ اختیار کیا ہے جو شاید علمار رسوم کے اس طبقہ میں پسند نہ کیا جائے جو "تدین" کی مشق میں اپنے "تعقل" کو کھو بیٹھے ہیں۔ حتیٰ کہ اب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دیندار کے معنی ہی گویا احمق کے ہیں۔ لیکن اس باب میں آپ نے سلف کا جو طریقہ تھا اس کو دیکھ لیا۔ ایک طرف کتاب، سنت، صحابہ، سلف صالح کے اتباع پر اتنا زور ہے لیکن اسی کے ساتھ عقل میں جو بات آتی ہو اس سے خواہ مخواہ گریز کی بھی ضرورت نہیں اور بلاوجہ ایسے مطالب پر اصرار کی حاجت نہیں جن سے عام عقول میں گونہ تشویش پیدا ہو۔ میرے نزدیک اس زمانہ کے علمار کے دونوں طبقوں یعنی ان علمار کے لئے جنھوں نے صرف عقل مجسم بن کر دین کو اپنے اندر سے خارج کر دیا ہے وہ دین میں صرف انہی چیزوں کو پانا چاہتے ہیں جنھیں عقل کی راہ سے وہ پہلے ہی پا چکے ہیں۔ اور ان کے لئے بھی جنھوں نے اپنے طرزِ عمل سے یہ باور کرانا شروع کیا ہے کہ العیاذ باللہ دین اور حماقت (عقلی نقص) دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ دونوں کے لئے طحاوی کے مسلک وسط میں اچھا نمونہ ہے۔

افسوس ہے کہ میں نے اپنے مقالہ میں جن جن چیزوں کے ذکر کا شروع میں ارادہ کیا تھا مضمون کی طوالت نے اب اس کا موقع باقی نہیں رکھا کہ ایک امتحان کے مقالہ میں اپنا حوصلہ نکالوں، کافی سے زیادہ ضخامت ہو چکی ہے لیکن میں نے آغاز بیان میں اشارہ کیا تھا کہ حدیث کے سوا امام طحاوی کا قرآن فہمی میں جو پایہ ہے اس کے نمونے بھی پیش کروں گا اگرچہ ضمناً معجزۂ شق القمر کے سلسلے میں "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ" کی قرآنی آیت اور اس کے مفہوم کا ذکر بھی آ گیا ہے اور گویا طحاویؒ نے جن خیالات کا اس سلسلہ میں اظہار کیا ہے ان کی حیثیت ذیلی

مضمون کی ہے۔ تاہم اتنا تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طحاوی قرآنی آیات کے مفہوم کے متعین کرنے میں سباق وسیاق کا لحاظ ضروری قرار دیتے ہیں اس کو طے کرتے ہوئے کہ "انشق القمر" کا تعلق قیامت کے واقعات سے ہے یا ان آیات سے ہے جو بطور نشانی[۵] کے نبوت کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ طحاویؒ نے آیت کے سباق وسیاق کو پیش کرکے مطلب جس طرح متعین کیا ہے وہ

۵؎ اس سلسلہ میں دلچسپ بات ابن رشد کی ہے۔ عام معجزات کے متعلق ان کا دعوٰی ہے کہ نبوت سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ گویا نبوت کی تصدیق کے لئے لاٹھی کو سانپ بنا کر دکھانا ابن رشد کے نزدیک ایسی بات ہے کہ طبیب اپنے کمال طبابت کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرے کہ میں جوتے گانٹھنا خوب جانتا ہوں۔ لیکن افسوس! حکیمانہ عقل کے بعد بھی انھوں نے ایسی مہمل بات کہی۔ واقعہ یہ ہے کہ نبوت کے دعوے کرنے والے "علی کل شئی قدیر" یا ہمہ توان خدا سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ پوچھنے والے کو حق پیدا ہو جاتا ہے کہ اس تعلق کے ثبوت میں وہ پوچھے کہ خدا تو ہر چیز پر قادر ہے۔ آپ کا خدا سے اگر تعلق ہے تو ایسی بات جس پر عام انسانی قوت قادر نہیں ہے اسے کرکے دکھائیے تاکہ معلوم ہو کہ واقعی "علی کل شئ قدیر" سے تمہارا تعلق ہے۔ نبوت پر اعتراضات وتنقیحات کا سلسلہ جو قائم ہو سکتا ہے ان میں یہ پہلی تنقیح ہے جو خدا سے تعلق رکھنے کے مدعیوں کے متعلق دلوں میں پیدا ہوتی ہے اولیاء اللہ وغیرہم حضرات مقربین بارگاہ الٰہی کے متعلق کرامتوں کی جو عام جستجو قلوب میں پائی جاتی ہے وہ اس فطری تنقیح کی ایک شکل ہے۔ پیغمبر اس اعتراض یا تنقیح کے جواب میں مطالبہ کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ یعنی ایسی بات دکھا دیتے ہیں جس سے یہ اعتراض تو اٹھ جاتا ہے کہ اگر "علی کل شی قدیر" سے اس کا تعلق ہوتا تو اس کی نشانی پیش کرتا۔ پس معجزات اسی معنی کے لحاظ سے برہان اور اس تنقیحی وسوسہ کے قاطع ہیں۔ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آیات کو "برہان" اسی اعتبار سے کہا گیا ہے۔ لیکن اس وسوسہ کے ازالہ کے بعد دوسرا وسوسہ یا دوسری تنقیح یہ قائم ہوتی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ خدائی تعلق کا نتیجہ نہ ہو بلکہ ساحرانہ قوتوں یا سائنس کے کسی مخفی ناموس کے علم کا نتیجہ ہو۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم فرعونی تنقیح ہے۔ فرعون نے "ان هذا لكبيركم الذي علمكم السحر" سے اس کا اظہار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلی تنقیح یا اعتراض کے جواب کے بعد جواب پر نیا اعتراض ہے۔ اس کا جواب بھی نیا اور دوسرا ہونا چاہئے لوگ پہلی تنقیح کے جواب میں اس دوسری تنقیح یا اعتراض کا جواب تلاش کرتے ہیں یہی ان کی غلطی ہے۔

آپ دیکھ چکے۔ نیز اسی کے ساتھ قرآنی آیات کی تاویل و تفسیر میں جس مسئلہ کی طرف طحاوی نے اشارہ کیا ہے یعنی قرآن جن لوگوں میں نازل ہوا جس ماحول میں نازل ہوا۔ اس میں جس طرح سمجھا گیا اگر اس سے ہٹ کر اس کے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو قرآن کا سمجھنا نہ ہوگا بلکہ اپنی سمجھ کو قرآن قرار دینا ہوگا۔

(باقی آئندہ)

منشور دہلی

جو کہ
براہِ راست قائدِاعظم محمد علی جناح کی سرپرستی
میں سید حسن ریاض کی ادارت میں نکل رہا ہے
لیگ کا مشہور ترجمان ہے
منشور میں تاریخی اور بہترین اصلاحی مضامین ہوتے
ہیں اور ہندوستان کے مشہور انشا پرداز لکھتے ہیں
متانت، سنجیدگی اور مذاق کی شستگی کے اعتبار سے
منشور ہندوستان میں بے نظیر ہے اور اپنے محاسن
میں ترقی کر رہا ہے۔ بلند پایہ نظمیں ہوتی ہیں اور
حالیہ سیاست سے متعلق تصاویر بھی۔ حجم ۱۶ صفحات
سائز ۲۰×۲۶/۴ قیمت سالانہ چھ روپے۔ (سے)
ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ ۳ر
منشور کا سالانہ نمبر ۹ر جنوری ۱۹۴۴ء کو نہایت
آب و تاب سے شائع ہوگا، اسمیں اجلاس کراچی کی مفصل
کارروائی خطبہ صدارت وغیرہ کے علاوہ بلند پایہ
ادبی مضامین و تصاویر ہونگی قیمت ۸
مستقل خریداران کو صرف چندہ ہی میں ملیگا
آپ بھی مستقل خریدار بن جائیے

منیجر
منشور دریا گنج دہلی

سہ روزہ
"زمزم"
کا اجرار
ہندوستان کے مشہور قومی اخبار
"زمزم" لاہور، کو حکومتِ ہند اور حکومتِ
پنجاب دونوں نے شائع کرنے کی اجازت
دیدی ہے جس کا پہلا پرچہ خاص نمبر کی
صورت میں یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو شائع
ہوگیا ہے

منیجر اخبار زمزم لاہور